امتحانی مشق نمبر 2

(یونٹ 5 تا 9)

سوال 1- محمد طفیل کی خاکہ نگاری پر تفصیلی روشنی ڈالیں۔ (20)

سوال 2- نصاب میں شامل نظیر صدیقی کے انشائیہ کا فکری فنی جائزہ لیں۔ (20)

سوال 3- مٹی کا دریا اور سرگزشت کا تقابلی مطالعہ کریں۔ (20)

سوال 4- اردو سفرنامہ نگاری میں ابن انشا کا مقام و مرتبہ بیان کریں۔ (20)

سوال 5- مشتاق احمد یوسفی کے طرز تحریر تفصیلی مضمون لکھیں۔ (20)

ANS 01

خاکہ نگاری کی ایک عظیم روایت ہمارے سامنے ہے۔ خاکہ نگاری جسے شخصیت نگاری کے نام سے بھی ہم جانتے اور سمجھتے ہیں ہر عہد، ہر ملک اور ہر زبان میں اس کے نمونے اور نقوش ملتے ہیں۔انسانی تاریخ کے اوراق اس کے شاہد ہیں کہ کسی شخصیت سے متاثر ہونا، اس سے عقیدت و قربت، محبت اور محبوبیت ایک فطری امر ہے، جس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ وہ شخصیت کوئی بھی ہوسکتی ہے۔ زندگی اور زمانے کے بدلتے ہوئے مزاج و میلان، نشیب و فراز ڈوبتی ابھرتی انسانی زندگی کے تمام رنگ و روپ خاکہ نگاری میں دیکھنے اور پڑھنے کو ملتے ہیں معاملہ مذہبی ہو یا پھر معاشرتی و سماجی، علمی و ادبی ہو یاسیاسی، بڑی شخصیت ہو یا معمولی، عالم ہو یاجاہل،حکمراں ہو یا سماج کا ایک ادنیٰ انسان، مصنف کسی سے بھی متاثر ہوسکتا ہے اور کسی شخصیت کو موضوع و محور بناسکتا ہے۔ خاکہ ایک بے حد نازک فن ہے۔ یہاں قلم پر بے پناہ گرفت کے ساتھ ساتھ جرأ ت اور سلیقہ مندی بھی درکار ہے۔ تھوڑی سی لاپرواہی اور کوتاہی خاکہ کو مجروح کردیتی ہے۔ اس لیے مصنف کو بہت ہی احتیاط اور صبر و ضبط کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔ ایک ایک قدم بہت سوچ سمجھ کر بڑھانا ہوتا ہے۔ ایک ایک پہلو اور گوشے کو مصنف کو ملحوظ رکھنا ہوتا ہے۔ اس لیے دنیا کی مختلف زبانوں میں بے شمار خاکے لکھے گئے مگرشاہکار کا درجہ کم ہی کے حصے میں آیا۔

فرانسیسی، عربی، روسی، جرمنی، چینی، انگریزی وغیرہ ترقی یافتہ زبانوں میں اس صنف کے کئی شاہکار اور اعلیٰ نمونے ہم آسانی سے تلاش کرسکتے ہیں۔ اردو میں خاکہ و شخصیت نگاری کے لیے ایک اور انگریزی لفظ (Pen Portrait) کا بھی استعمال کیا جاتا ہے، حالانکہ انگریزی زبان و ادب میں دونوں الفاظ Pen Portraitاور Sketchالگ الگ معنی و مفہوم میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ خاکہ و شخصیت نگاری کے معروف ناقد پروفیسر داؤد احمد رقم طراز ہیں:

Downloaded From Talassus.com

"Sketch مختلف خطوط کی مدد سے کسی شخصیت کے خد و خال ابھارنے کو کہا جاتا ہے، جب کہ Portrait سے مراد کسی واضح شبیہ کی عکاسی ہے۔ خاکہ کو شخصی مرقع یا شخصیہ بھی کہتے ہیں اور خاکہ نویسی کو شخصیت نگاری کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ ایک اچھے خاکے میں ہم کسی شخص کے بنیادی مزاج، اس کی افتاد طبع، انداز فکر و عمل اور اس کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں سے روشناس ہوتے ہیں۔ خاکہ نگاری کسی شخصیت کا معروضی مطالعہ ہے، جس کے لیے خاکہ نگار کی قوت مشاہدہ، فہم و ادراک اور غیر جانبداری کے ساتھ ہمدردانہ رویہ اور پُر اثر اندازِ بیان کا حامل ہونا ضروری ہے۔خاکہ کسی فرد یا شخص کی مکمل زندگی کا عکاس نہیں ہوتا بلکہ اس کی نمایاں خصوصیات کا اظہار لیے ہوتا ہے۔ خاکہ نگار عموماً شخصیت کی زندگی کے ان گوشوں کی طرف توجہ مبذول کراتا ہے، جو نظر سے اوجھل رہتے ہیں اور بسا اوقات کئی شخصیت انھیں خود بھی چھپا کر رکھتی ہیں لیکن ایک اچھے خاکے کی یہی خصوصیت ہے کہ وہ شخصیت کے محاسن و معائب کو ناقدانہ رویے کے بجائے ہمدردانہ رویے کے طفیل ہر طرح سے سامنے لے آئے، کیوں کہ خاکہ میں بنائی جانے والی تصویر کی اصل شخصیت سے مطابقت ضروری ہوتی ہے، اگر تصویر اصل شخصیت سے ذرا سی بھی مختلف ہوگی تو خاکہ ناقص قرار پائے گا۔ خاکہ صرف اس شخصیت کا لکھا جاسکتا ہے، جس کی شخصیت سے خاکہ نگار کو کسی طرح کی دلچسپی ہو۔ خاکہ کسی پر بھی لکھا جاسکتا ہے۔ بادشاہ ہو یا فقیر، امیر ہو یا غریب، تاجر ہو یا آمر، استاد ہو یا شاگرد، اعلیٰ ہو یا ادنیٰ، پروفیسر ہو یا چپراسی، ولی ہو یا ظالم وغیرہ۔پوری علمی و ادبی دنیا جانتی ہے کہ اردو ادب میں باضابطہ خاکہ نگاری کی ابتدا مرزا فرحت اللہ بیگ کی مشہور و معروف کتاب 'نذیر احمد کی کہانی، کچھ ان کی کچھ میری زبانی' (1927) سے ہوتی ہے، مگر کچھ محققوں اور ناقدوں نے اس سے بھی قبل اس صنف کے نمونے اور نقوش تلاش کرنے کی کوشش کی ہے ان میں محمد حسین آزاد، ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر محمد حسن، شمیم کرہانی، صابرہ سعید، حسن احمد وغیرہ کے نام نامی قابلِ ذکر ہیں۔ بہرکیف اردو زبان میں خاکہ و شخصیت نگاری کا باضابطہ آغاز مرزا فرحت اللہ بیگ کو ہی تسلیم کیا جاتا ہے اور اس صنف خاکہ کو آگے بڑھانے اور پروان چڑھانے والوں میں خواجہ حسن نظامی، شاہد احمد دہلوی، رشید احمد صدیقی، اشرف صبوحی، مولوی عبد الحق، جوش ملیح آبادی، دیوان سنگھ مفتون، خواجہ محمد شفیع، مرزا محمد بیگ، مشتاق احمد یوسفی، کرنل محمد خاں، کنہیا لال کپور، شورش کاشمیری، فرحت کاکوروی، مالک رام، جگن ناتھ آزاد، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، شوکت تھانوی، فکر تونسوی، بیگم انیس قدوائی، منظر علی خاں منظر، قرۃ العین حیدر، کشمیری لال ذاکر، باقر مہدی، انور عظیم، سردار جعفری، مہندر ناتھ، مجتبیٰ حسین،

Downloaded From Tajassus.com

یوسف ناظم، انتظار حسین، چراغ حسن حسرت، سید صباح الدین، لطیف کاشمیری، منصور آفاقی، اے حمید، صادق الخیری، حافظ لدھیانوی، صالحہ عابد حسین، مجید لاہوری، علی جواد زیدی، کرشن چندر، مشفق خواجہ، اقبال متین، ابراہیم جلیس، نظیر صدیقی، غضنفر وغیرہ جیسے لکھنے والوں کی ایک طویل فہرست ہے۔اردو خاکہ و شخصیت نگاری کی جدید تاریخ میں ایک اہم نام محمد طفیل کا ہے۔محمد طفیل جسے اردو دنیا محمد نقوش کے نام سے جانتی اور پہچانتی ہے۔ 'رسالہ نقوش' کے درجنوں شاہکار نمبر دستاویزی حیثیت کے حامل ہیں۔ نقوش کا رسول نمبر نہ صرف اردو بلکہ پوری ادبی دنیا میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس کی دوسری کوئی نظیر دنیا کی کسی زبان میں نہیں ملتی۔ یہاں تک کہ عربی زبان میں بھی نہیں۔ اس تاریخی، روحانی اور عالمی شاہکار رسول نمبر نے محمد طفیل کو پوری ادبی و علمی دنیا میں زندہ و جاوید بنادیا۔ محمد طفیل نے اپنی پوری علمی، ادبی اور صحافتی زندگی میں صرف اور صرف دو ہی ادبی و صحافتی کام کیے، ایک رسالہ نقوش کی ادارت اور اس سلسلے میں ادیبوں، دانشوروں اور شاعروں اور لکھنے پڑھنے اور علمی و ادبی ذوق و شوق رکھنے والوں سے خط و کتابت کی اورخاکے لکھے۔ ان کے خاکوں کے مجموعوں میں 'آپ'، 'آداب'، 'محترم'،'مکرم'، 'معظم'، 'محبی'، 'مخدومی' وغیرہ پوری ادبی و علمی دنیا میں اپنی ایک خاص دلکشی، اہمیت، عظمت، جاذبیت، ادبیت، معنویت اور تہہ داری رکھتے ہیں۔ محمد طفیل نے خود ہی لکھا ہے کہ جو کام ہم نے الف سے شروع کیا تھا، 'ی' پر ختم کیا۔ محمد طفیل نے جدید اردو خاکہ و شخصیت نگاری کو ایک نئی تازگی و توانائی، وقار و وزن، بلند مقام و مرتبہ عطا کرکے دنیا کی معتبر و مستند زبانوں کے مد مقابل اردو خاکہ نگاری کو کھڑا کردیا۔ جسے ہم کسی طور فراموش یا نظر انداز نہیں کرسکتے۔ محمد طفیل نے خاکہ نگاری کے فن کو چاول پر 'قل ھو اللہ' لکھنے کا عمل قرار دیا ہے۔ محمد طفیل کے خاکے جدید اردو ادب میں ایک نئے باب کا آغاز اور اضافہ ہیں۔

یہاں یہ صراحت بھی ضروری ہے کہ جہاں ایک طرف اردو خاکہ نگاری کی تاریخ میں مردوں کی ایک لمبی فہرست ہے، وہیں اس صنف خاکہ کو چند خواتین خاکہ نگار کو ایک نئی سمت اور رفتار، وقار و بلندی سے روشناس کرانے اور پرچم لہرانے کا کام کیا ہے۔ ان میں قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، صغرا مہدی، جیلانی بانو، بیگم انیس قدوائی، صالحہ عابد حسین، عفت آراء، پروفیسر شمیم نکہت، ادا جعفری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ عصمت چغتائی نے اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی کا خاکہ 'دوذخی' کے نام سے لکھا اور اس کی ادبی و علمی اہمیت و عظمت آج بھی دیر اور دور تک محسوس کی جاتی ہے۔ قرۃ العین حیدر نے چند ہی خاکے لکھے مگر ان کے خاکوں میں ان کی عالمانہ و دانشورانہ صلاحیتوں کا بھر پور مظاہرہ ملتا ہے۔ صالحہ

Downloaded From Tajassus.com

عابد حسین نے کئی شاہکار اور دلچسپ خاکے لکھے۔ جو آج بھی ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ ہند و پاک کی کئی نامور خواتین نے نہایت ہی خوبصورت اور دلکش خاکے لکھے ہیں۔ میں یہاں بطور خاص ایک ایسی خاتون خاکہ نگار کا تذکرہ کرنا ضروری تصور کرتی ہوں جن کا نام عفت آرا ہے۔ آپ عالمی شہرت یافتہ اردو و انگریزی کے ادیب و ناقد پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی صاحبزادی ہ یں اور آپ کا تعلق بھی شعبۂ انگریزی سے رہا ہے اور اب سبکدوش ہوچکی ہیں۔

عفت آرا کی کتاب ’نشیب و فراز‘ میں جہاں سفر نامے، مضامین، ترجمے اور کہانیاں ہیں، وہیں تیرہ نہایت دلچسپ اور خوبصورت خاکے ہیں۔ ان خاکوں میں ’حضرت بی بی فاطمہ زہراؓ ایک تاثر‘، ’پروفیسر اسلوب احمد انصاری - پیکر فکر و فن‘، ’ڈاکٹر سید امین اشرف-ایک تاثر‘، ’الوداع اے شمع بزم سخن‘، ’ز-خ-ش- صد ف بے مثال‘، ’خاموش سفر (پروفیسر نقی حسین جعفری کی یاد میں)‘، ’مدر ٹریسا-ایک فرشتہئ رحمت‘، ’رسکن بونڈ- ذرہئ تابناک‘، ’ڈاکٹر شائستہ محسن-ایک شمع فروزاں‘، ’سعیدہ آپا کی یاد میں‘، ’چراغِ سحر تمام ہوا‘، ’جہاں آرا - پیکر یاس و حسرت‘ یہ تمام خاکے مصنفہ کی لیاقت و ذہانت، عرق ریزی و عمیق مطالعہ اور عالمانہ و دانشورانہ صلاحیتوں کی بھرپور غماضی کرتے ہیں۔ خود مصنفہ کے لفظوں میں:

”خاکے لکھنے کا وصف بھی یورپ کے مصنّفین کی دین ہے کیوں کہ Addison and Steeleنے جس مہارت سے خاکہ نگاری کی ہے ان کی تقلید سے دوسرے لکھنے والوں کو بھی تقویت ملی اور انھوں نے اس فن کو تکمیل تک پہنچایا اور پھر ہم نے بھی اسے اپنے انداز میں لکھنے کا شوق پورا کیا۔ لکھنے والوں کو لکھنے کے دوران بڑا ہوشیار رہنا پڑتا ہے۔ کیسے مرقع نگاری بھی بھر پور ہو اور اچھی اور معیاری زبان کا استعمال ہو، قاری کو اپنے مطالعہ میں بھی شریک کیا جاسکے اور اندازِ بیان دلچسپ ہو تاکہ خاکہ نگاری میں کمال حاصل ہو سکے۔ لکھنے کے میدان میں قدم رکھنا گویا تنقید کو دعوت دینا ہے اور اس لیے یہ عمل جوئے شیر لانے کے مقابل ہے۔ اگر کسی بھی لحاظ سے کچھ کمی محسوس ہوگی تو قارئین آپ کی تحریر کو دور ڈال دیں گے اور آپ سر دُھنتے رہ جائیں گے۔ ہم خود بھی تو اچھی چیز کا انتخاب کرتے ہیں اور بیکار شے کو رد کردیتے ہیں“۔ (نشیب و فراز، ص10-11)

شاعری میں جس طرح رباعی کا فن تسلیم کیا گیا ہے، ٹھیک اسی طرح اصناف نثر میں خاکہ نگاری کی صنف بھی تسلیم کی گئی ہے۔ مصنف کو اپنی تیسری آنکھ کا بھی استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے اردو میں مرزا فرحت اللہ بیگ سے لے کر غضنفر تک بے شمار خاکے لکھے گئے ہیں۔ سیکڑوں کی تعدادمیں خاکوں کے مجموعے منظرِ عام پر آچکے اور آرہے ہیں مگر ان میں چند خاکہ نگار ہی ہیں جو اپنی منفرد و مخصوص پہچان بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ غالب پر

Downloaded From Tajassus.com

مالک رام کا لکھا ہوا خاکہ، پروفیسر رشید احمد صدیقی کا اپنے شعبۂ اردو کے چپراسی کندن کا خاکہ اور خود مستند و معتبر ادیب و ناقد پروفیسر نظیر صدیقی کا مرحوم نظیر صدیقی کے نام کا خاکہ آج بھی پڑھنے والے بھول نہیں سکتے۔

اردو زبان و ادب میں بھی ادھر کئی برسوں میں کئی شاہکار اور نہایت دلچسپ خاکوں کے مجموعے منظرِ عام پر آئے ہیں۔ ان میں مالک رام کا 'وہ صورت الٰہی' پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا 'آنکھیں ترستیاں ہیں'، پروفیسر رشید احمد صدیقی کا 'گنج ہائے گراں مایہ'، پروفیسر نظیر صدیقی کا 'جان پہچان'، منظر علی خاں منظر کا 'خاکہ نما' مولوی عبد الحق، 'چند ہم عصر'، خواجہ غلام السیدین 'آندھی میں چراغ' کے علاوہ کئی مشہور و معروف ادیبوں اور دانشوروں کے خاکوں کے مجموعے شائع ہوئے ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری و ساری ہے۔

اردو خاکہ نگاری آج ترقی کی کئی منزلیں طے کرچکی ہے۔ جس صنفِ خاکہ نگاری کی ابتدا مرزا فرحت اللہ بیگ سے ہوئی ہو اور دیکھتے دیکھتے اردو خاکہ نگاری کی جدید تاریخ میں کئی ایسے اہم خاکہ نگار ابھر کر سامنے آئے جن کی خاکہ نگاری نے اس صنف کو ایک نئی تازگی و توانائی، دلکشی و شگفتگی اور ادبی وقار و معیار بخشنے کا کام انجام دیا، ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو خاکہ نگاری کی اس تابندہ و درخشندہ روایت کو فرحت اللہ بیگ کے بعد کی آنے والی نسلوں نے نہ صرف پروان چڑھایا بلکہ دنیا کی معتبر و مستند زبانوں کے مدِ مقابل کھڑا کرنے کا کام بھی انجام دیا۔ 1970کے بعد صنف خاکہ کی طرح دوسری اصناف سے تعلق رکھنے والے دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں نے بھی خاکہ نگاری کے باب میں کئی اضافے بھی کیے۔ آج اردو کے رسائل و جرائد میں بھی کثرت سے خاکے شائع ہورہے ہیں اور دلچسپی سے پڑھے جارہے ہیں۔

ANS 02

بیسویں صدی میں انشائیہ کو تنقیدی اور تخلیقی ہر دو سطحوں پر متعارف کرنے والوں میں نظیر صدیقی اس صنف کے متعلق جن خیالات کا اظہار کرتے ہیں ان میں جو بات انھیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے وہ انشائیہ میں طنز کی شمولیت ہے۔

نظیر صدیقی کے انشائیوں کا مجموعہ شہرت کی خاطر اپنی تحریروں میں اسی خصوصیت کے ساتھ انشائیہ کا ایک نیا رنگ و آہنگ پیش کرتا ہے۔ بعض ناقدین کا یہ خیال ہے کہ نظیر صدیقی کی ظرافت چونکہ طنز کی جراحت سے حد درجے آشنا ہے اسی لئے انھوں نے اس کتاب کے دیباچے میں انشائیہ کے متعلق اپنے نظریات میں اسی عنصر پر زور دیا ہے، وہ لکھتے ہیں :

Downloaded From Tajassus.com

’ میں جن حالات و حوادث سے گزرتا رہا ہوں ا ن کے اثر سے میری زندگی بڑی حد تک غم و غصّے کا شکار رہی ہے یہی غم و غصّہ میری شاعری اور میرے انشائیوں کے محرکات رہے ہیں۔ میری شاعری کا محرک غم ہے اور میرے انشائیوں کا محرک غصّہ۔ یہی وجہ ہے کہ میرے انشائیوں میں مزاح سے زیادہ طنز کا عنصر نمایاں ہے۔ 1

نظیر صدیقی انشائیوں کو متضاد عناصر کا مرکب قرار دیتے ہوئے جن مختلف عناصر کے اتصال پر انشائیہ کو کھڑا دیکھتے ہیں ان میں سنجیدگی اور غیر سنجیدگی کے علاوہ حکمت سے حماقت تک کے مرحلے، بے خودی میں ہشیاری اور رندی میں مستی کا شمار ہے۔

وہ انشائیہ کی تعریف پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

’’انشائیہ ادب کی وہ صنف ہے جس میں حکمت سے لے کر حماقت تک ساری منزلیں طے کی جا تی ہیں۔ یہ وہ صنفِ ادب ہے جس میں بے معنی باتوں میں معنی تلاش کئے جا تے ہیں اور بامعنی باتوں کی مہملیت اجاگر کی جا تی ہے۔ یعنی Sense میں Non Sense اور Non Sense میں Sense ڈھونڈا جا تا ہے۔ یہ وہ صنف ہے جس میں لکھنے والا غیر سنجیدہ ہونے کے با وجود سنجیدہ اورسنجیدہ ہو نے کے با وجود غیر سنجیدہ یعنی بالفاظِ غالبؔ لکھنے والے کی بے خودی میں ہشیاری اور ہشیاری میں بے خودی پا ئی جا تی ہے۔ یہ وہ صنفِ ادب ہے جس میں کہیں سچ میں جھوٹ اور کہیں جھوٹ میں سچ کی آمیزش ہو تی ہے۔ یہ وہ صنفِ ادب ہے جس میں نہ صرف اپنا نام اور دوسروں کی پگڑی اچھالی جا تی ہے بلکہ اپنی پگڑی اور دوسروں کا نام بھی۔ ‘

یہ سچ ہے کہ انشائیہ نثر اور غنائیت، احساس اور تفکر، داخل اور خارج کا نقطہ اتصال پیش کرتا ہے لیکن نظیر صدیقی جن دو آفاق کو انشائیہ کی زمین پر باہم مربوط کرتے ہیں وہ اردو میں ایک نئی چیز ہیں۔ نظیر صدیقی کے انشائیوں میں بھی حکمت سے حماقت تک کے تمام مرحلے طے ہو تے نظر آ تے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں شخصیت طنز کے وار پر ہی اپنا اظہار کرتی ہے۔ ان کے ایک مضمون کا اقتباس درج ذیل ہے۔

’غنڈو ں کے بار ے میں سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ ایک غنڈہ ہر آ دمی کے اندر ہو تا ہے اور باقی غنڈے شہر کے اندر ہوتے ہیں۔ جب کسی مقصد کی تکمیل میں اندر کے غنڈے سے کام نہیں چلتا تو باہر کے غنڈے بلائے جا تے ہیں۔ بڑے بڑے انقلابوں کو ممکن بنانے میں غنڈوں کا جو ہاتھ رہا ہے تاریخ میں اس کا اعتراف کہیں نہیں ملتا اس کی ایک وجہ غالباً یہ بھی ہے کہ تاریخ صرف حقائق اور واقعات کے اندراج سے عبارت نہیں بلکہ بہت سے حقائق اور واقعات کے اخفاء سے بھی عبارت ہے۔ 2

Downloaded From Tajassus.com

نظیر صدیقی نے اپنے انشائیہ ’ غنڈے ‘ ہی کی طرح ’امتحان گاہ ‘ میں بھی موضوع کو ایک وسیلہ کے طور پر اختیار کیا ہے جس کی مدد سے وہ سماج ملک اور قومی مزاج کے علاوہ عصری زندگی کے حقائق طشت از بام کرتے چلے گئے ہیں۔ نظیر صدیقی کے انشائیوں میں انشائیہ نگار کی بصیرت اور سوجھ بوجھ کے شواہد قدم قدم پر ملتے ہیں ان کی تحریریں بیسویں صدی میں تخلیق ہو نے والے انشائیوں کے درمیان ایک نئی آ ب و ہوا کا احساس دلاتی ہیں۔

ANS 03

میرزا ادیب کا حقیقی نام دلاور علی تھا۔ انھوں نے اپنے تخلیقی سفر میں گھریلو زندگی سے مواد حاصل کیا اور ادب کے میدان میں اپنی راہیں خود استوار کیں۔ ان کا اپنا حساس ذہن ان کے تخلیقی سفر میں بچپن سے ہی معاون ثابت ہوا جس کی بدولت میرزا ادیب کی طبیعت میں طفولیت پسندی آگئی تھی۔ اس طفولیت پسندی کی نفسیاتی وجہ بچپن کی آوارہ گردی اور شوقِ مطالعہ تھا۔

ایک معمولی گھر کے مند دیے جیسی ہے میرزا ادیب کی زندگی۔ یہ ’’دیا‘‘ دلاور علی کے چراغ حیات کے ساتھ ہنگامی حالات میں 4 اپریل1914 کو روشن ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا ایک عالمی جنگ کے اندھیروں سے جوجھ رہی تھی۔ یوں تو دلاور علی نے چھ، سات برس کی عمر میں ہی ارد گرد کی اشیا کو بہ غور دیکھنا شروع کردیا تھا لیکن عالمی جنگ کے اثرات اور انسانی زندگی پر اس کے نتائج کی قلم بندی کا آغاز 21-22 کے سن میں میرزا ادیب نے کیا۔

عین ممکن ہے کہ عالم میں مشہور شہر لاہور کے بھاٹی دروازے کے محلہ ستھاں اور محلہ ستھاں میں چوک دیوی دتّا کے پہلو سے نکلنے والی گلی مغلاں میں زندگی کاٹ رہا میرزا ادیب کا خاندان جہالت کے اندھیروں میں ہی رہتا لیکن میرزا ادیب نے علم کی ضیا سے تاریکی کو منور کردیا، اسی لیے وہ اپنی سوانح ’مٹی کا دیا‘ میں اپنے وجود کو روشنی سے تعبیر کرتے ہیں۔ مٹی کے دیے سے پھیلنے والی مدھم مدھم روشنی کا اظہار میرزا ادیب کی تحریروں میں جابہ جا ہوا ہے۔ بوسیدہ سے گھر کے طاق میں رکھے ہوئے مٹی کے دیے نے بچپن سے ہی میرزا ادیب کو بہت متاثر کیا۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اُس دیے نے انھیں تخلیق کی روشنی بھی بخشی۔

میرزا ادیب کی تخلیقی شخصیت پر تین چیزوں نے گہرا اثر ڈالا۔ ان میں سے ایک جاندار اور دو بے جان تھیں۔ ایک بے جان چیز تھی ’مٹی کا دیا‘۔ مٹی کے اس دیے سے وابستہ امور، میرزا ادیب کے لیے معمولی نہ تھے۔ جب کوئی چڑیا دِیوے کی بتی لے اڑتی تو میرزا ادیب اپنی آپا اور اسکولی ساتھیوں سے اس کی وجہ معلوم کرتے اور تسلّی بخش جواب نہ پا کر یہ اخذ کرتے کہ

Downloaded From Tajassus.com

چڑیا کے گھر میں دیا جلتا ہوگا اور اس کا بچہ بھی میری طرح دیے کو دیکھتا ہوگا۔ جب دیے کا تیل ختم ہوجاتا تو انھیں لگتا کہ دیوے کو بھوک لگی ہے اور یہ بے چارہ رورہا ہے۔ رحم دل میرزا ادیب اس میں پانی ڈال دیتا۔ اگلے دن جب ماں دیے کو مانجھتیں تو میرزا ٹکٹکی باندھے، دیوے کو دیکھتے رہتے کہ شاید اس دیے سے بھی کوئی دیو نکلے گا اور ان کی ساری پریشانیاں دور کردے گا۔ ایک بار جب دیے کی لو سے ماں کا دوپٹہ جل گیا تو انھیں پہلی بار دِیوے پر غصّہ آیا انھوں نے اس سے پوچھا۔

''کیو ں جلایا میری امی کا دوپٹہ؟''

میرزا نے دیکھا کہ یہ سُن کر لو ذرا تھم گئی ہے، اس نے سر جھکا لیا ہے، یوں لگا کہ دیوا معافی مانگ رہا ہے۔

دیے کی روشنی میں پڑھتے پڑھتے وہ جب دیے کو ٹکٹکی لگا کر دیکھتے رہتے ہیں تو دیا نہ جانے کیا کیا بن جاتا ہے، مختلف رنگ یکے بعد دیگرے ہویدا ہوتے رہے ہیں، کبھی اس کا رنگ نیلا، کبھی لال تو کبھی سبز دکھائی دینے لگتا ہے۔ ایک بار انھوں نے کیا دیکھا کہ دیے سے ایک سبز پری نکلی آرہی ہے، یہ پری ان کے تصور میں بسی وہ شفیق خاتون تھی جو کبھی وکٹوریہ اسکول کے دروازے پر سبز کپڑے پہنے ملی، اور نہایت شفقت سے ان کی ہتھیلی پر کھٹّی میٹھی گولیاں رکھ کر چلی گئی۔ اسے گئے برس پہ برس بیتے پر میرزا کے ذہن سے وہ کبھی نہ جاسکی۔

دوسری بے جان چیز دادا جان کی کتابوں کا وہ صندوق تھا جو میرزا ادیب کے دورِ طفولیت کا گویا ایک جزوبن گیا تھا۔ گھر کے لوگ اس کے احترام میں بس یہ کرتے تھے کہ کوٹھری کے آخری حصّے میں بہ حفاظت رکھ چھوڑا تھا اور کسی کو اس پر پاؤں رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن میرزا ادیب اس کا احترام کچھ اور ہی ڈھنگ سے کرتے تھے۔ جب وہ اسکول میں داخل نہیں کیے گئے تھے تب بھی وہ کوٹھری میں ہر دوسرے تیسرے دن جاتے۔ پھر جو شغل تھا وہ حسب ذیل ہے:

عجیب خوشبو آتی تھی ان کتابوں سے، میں دیر تک ان کتابوں کو اُلٹتا پلٹتا رہتا151 ناک سے لگا کر ان کی خوشبو سونگھتا رہتا تھا۔ کتابیں بہت پُرانی تھیں مگر ہر کتاب کی سیاہی میں ایک خاص چمک باقی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ابھی ابھی لکھی گئی ہیں۔ (نقوش آپ بیتی نمبر، میرزا ادیب)

ایک بار میرزا ادیب کی چھوٹی بہن سے دادا کی ایک کتاب زمین پر گر گئی اور پھٹ گئی۔ اس کے بعد انھوں نے خواب میں دادا جان کو دکھی اور مغموم پایا۔ اُن کے ہاتھ میں وہی کتاب تھی جس کی جلد پھٹ گئی تھی۔ میرزا ادیب نے یہ خواب ماں کو سنایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گھر کے لوگ

Downloaded From Tajassus.com

ان کتابوں کا مزید احترام کرنے لگے اور میرزا کے والد نے صندوق پر ایک بڑا سا تالا ڈال دیا جو میرزا ادیب کے لیے انتہائی پریشانی کا سبب تھا۔ وہ رات دن دعائیں مانگتے کہ دادا جان ابّا کے خواب میں آجائیں اور انھیں حکم دیں کہ صندوق کھول دیا جائے تاکہ صندوق سے ان کی وابستگی بحال ہوجائے۔ لیکن میرزا ادیب کی مراد کچھ یوں پوری ہوئی کہ جو تالا صندوق میں لگایا گیا تھا وہ کوٹھری کا تھا، کوٹھری میں گہنوں اور قیمتی کپڑوں کا ٹرنک بھی تھا جس کا تالا صندوق میں لگا دیا گیا تھا۔ کچھ دنوں بعد ٹرنک کا تالا اپنے کنڈے میں واپس لگا دیا گیا تو گویا میرزا ادیب کی معصومانہ دعائیں قبول ہوگئیں اور پریشاں خیالی مٹنے لگی۔

مجھے اس صندوق سے اتنی دلچسپی تھی کہ اول تو ہر روز ورنہ دوسرے تیسرے دن ضرور اسے کھول کر دو تین کتابوں کی ورق گردانی کرلیتا تھا۔ سمجھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مگر مجھے ان کی رنگین، منقش اور مطلّا جلدیں اور ان کی خوشبو بڑی پسند تھی۔ عجیب خوشبو آتی تھی ان کتابوں سے۔ میں دیر تک ان کتابوں کو الٹتا پلٹتا رہتا تھا، ناک سے لگا کر ان کی خوشبو سونگھتا رہتا تھا۔ کتابیں بہت پرانی تھیں مگر ہر کتاب کی سیاہی میں ایک خاص چمک باقی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ابھی ابھی لکھی گئی ہیں۔

اس صندوق سے ا ن کو اس قدر دلچسپی ہوگئی تھی کہ میرزا نے اپنے دادا کا خیالی حلیہ بھی بنالیا تھا۔

میں جب صندوق سے کتابیں نکالتے ہوئے یا انھیں دوبارہ ترتیب سے رکھتے ہوئے دادا جان کا تصور کرتاتھا تو میرے سامنے ایک ایسا شخص آجاتا تھا جس کی سفید، پرعظمت داڑھی سینے پر پھیلی ہو، آنکھوں پر عینک ہو، چہرے پر نور برستا ہو اور جو بڑے وقار سے بیٹھے کوئی کتاب پڑھ رہے ہوں۔

تیسری جاندار چیز ان کی ماں تھیں جو ان کی ساری کائنات کا مرکز تھیں۔ اس تعلق سے میرزا ادیب لکھتے ہیں:

مجھے ان کی ذات سے کچھ ایسی وابستگی ہوچکی تھی اور وہ مجھ پر کچھ اس انداز سے چھا گئی تھیں کہ ان کے بغیر میں زندگی کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اُنھوں نے کبھی مجھ پر حکومت نہیں کی تھی۔ کسی طور پر بھی مجھے متاثر کرنے کی شعوری کوشش نہیں کی تھی لیکن میں تھا کہ ان کی طرف کھنچا ہی چلا جاتا تھا۔ ان کی آنکھوں میں شفقت کی روشنی تھی۔ پیشانی پر مامتا کا نور تھا اور لہجے میں پیار کی مٹھاس۔ اُس وقت جاگتی تھیں جب فضا میں اندھیرا ہوتا تھا اور قرآن مجید پڑھنے کے بعد گھر کے مختلف کاموں میں مصروف ہوجاتی تھیں۔ میں نے انھیں کبھی بے کار نہیں پایا۔ بیماری کے دنوں میں بھی نہیں۔ گھر کے کاموں سے فرصت ملتی تو چولھے کے پاس پیڑھی پر بیٹھ کر، حقّے کی نَے منہ میں لے کر، چھوٹی چھوٹی

Downloaded From Tajassus.com

رسّیوں میں گانٹھیں دے دے کر ان کے گچھے سے بناتی رہتی تھیں۔ ان گچھوں سے چلم کے لیے آگ بنتی تھی یا انھیں جلا کر سالن وغیرہ گرم کیا جاتا تھا۔

(نقوش، آپ بیتی نمبر، میرزا ادیب)

میرزا ادیب کی زندگی میں ان کی والدہ مذکورہ بالا دونوں ہے جان چیزوں کے درمیان ایک کڑی کی حیثیت بھی رکھتی تھیں۔ اس لحاظ سے کہ دیے کو ہر روز جلانے والی ان کی ماں ہی تھیں۔ صندوق کی کتابوں کا احترام اور دادا جان سے محبت کا جذبہ ماں کے ذریعے ہی ان کے دل میں پروان چڑھا تھا۔

میرزا ادیب نے اپنی سوانح میں ان تین چیزوں کے تعلق سے عہد طفولیت کے بارے میں جس انداز سے لکھا ہے وہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی بچہ مظاہرِ قدرت اور اشیا کے بارے میں گہرے غور و تفکر کا مشاہدہ کرے اور پھر اُنھیں اسی سادگی سے بیان بھی کرے گویا اس نے کائنات کے رموز میں سے کوئی رمز پالیا۔ میرزا ادیب کے ان چند سوانحی گوشوں کو پڑھ کر یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے یہاں عقل و دانش سے زیادہ تخیل کی کارفرمائی ہے۔ ان کے تخیل کو بچوں سے علاقہ ہے۔ اگر ہم بالغوں کے بالمقابل بچوں کی ایک الگ دنیا کا وجود تسلیم کرتے ہیں تو ہماری مراد ان کے خیال کی دنیا ہوتی ہے۔ لہٰذا ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ بچے کو عقل سے زیادہ تخیل سے کام رہتا ہے۔ ایک بچہ، اگر اسے پودوں اور گملوں سے دلچسپی ہے تو وہ گھر میں لگے گملوں میں کبھی پتھر، کبھی کاغذ اور کبھی پودوں کی کوئی نازک سی ٹہنی یا پتے یا پھول گاڑ دیتا ہے۔ گاڑنے کے اس عمل کے ساتھ ہی اس کے تخیل کی دنیا آباد ہونے لگتی ہے۔ ممکن ہے اس نے یہ بھی تصور کرلیا ہو کہ اس پتھر یا کاغذ کا پودا جب باہر آئے گا اور جب اس پر پتھر یا کاغذ پھلیں گے تو وہ کس طرح نظر آئے گا۔ بعض بچے تو سکّے بھی زمین میں گاڑ کر پیسے پیڑ پر اگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے بچوں کی دنیا اور بچوں کے ادب میں تخیل کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہی عنصر اس مضمون کا جواز ہے۔ وہ اس لیے کہ اب تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ بظاہر ایک ادیب کی سوانح کا گوشہ ہے لیکن غور کیا جائے تو ادب اطفال کی تخلیق میں معاون بچوں کے ذہن کے نہاں خانوں میں جھانکنے کا دریچہ بھی ہے۔ ایسے دریچے میرزا ادیب کی سوانح میں جابہ جا کھلے ہیں۔ ایسے تمام واقعات کا جائزہ لینا یہاں ممکن نہیں لیکن نمونے کے طور پر ایک اقتباس پیش کرنے کی گنجائش تو ہے ہی:

ان چند ہفتوں کو غیر اہم قرار نہیں دیا جاسکتا۔ کبھی تنہا اور کبھی منیر یا ستّار کے ساتھ اسکول کو جاتے ہوئے یا سکول سے آتے ہوئے باغ سے، اور تھوڑی سی مسافت کے لیے ایک ویرانے سے گذرنا پڑتا تھا۔

Downloaded From Tajassus.com

سائیں سائیں کرتے ہوئے درخت، فضا میں اُڑتے ہوئے پرندے۔ اور گھاس کے اوپر بے شمار گرے ہوئے پتے151 نہ جانے یہ چیزیں مجھے کیا کیا احساس دلاتی رہتی تھیں۔ خاص طور پر سبز یا سوکھے، افسردہ، پژمردہ پتوں پر جب ہم اپنے پاؤں رکھتے تھے تو چڑ چڑ کی سی آواز میرے دل میں ایک عجیب، ایک ناقابلِ بیان، ایک مبہم سی کیفیت طاری کردیتی تھی، مُنیر یا ستّار ان لمحوں میں جو کچھ کہتے تھے میں اچھی طرح سمجھ نہیں سکتا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ خاموش رہوں اور چلتا جاؤں۔ آگے ہی آگے۔ بس آگے ہی آگے۔

یہی وجہ ہے کہ میرزا ادیب نے جہاں کئی کہانیاں، ڈرامے، خاکے اور کالم لکھے، ادبی صحافت میں بھی نمایاں خدمات انجام دیں وہیں انھوں نے بچوں کے لیے بھی خاطر خواہ ترکہ چھوڑا جس میں ناول، ڈرامے اور کہانیاں شامل ہیں۔ اس سے ان کی طفولیت پسندی کو سند مل گئی۔ ساتویں کلاس میں انھوں نے پہلی بار ایک دوست کے کہنے پر ایک باغ میں بیٹھ کر 'بکری' پر شعر کہے۔ لیکن ان اشعار کو انھوں نے کہیں چھپوایا نہیں۔ البتہ عہد طفلی کے شعور کو کھنگالنے پر لاشعوری طور پر انھیں جو کچھ یاد آیا اسے اپنی خود نوشت میں درج کردیا، یہ بکری پر کہے گئے اشعار میں سے ابتدائی چار مصرعے تھے جو کچھ اس طرح ہیں ۔

میں نے دیکھی ہے آج اک بکری
دودھ دیتی ہے گھاس کھاتی ہے
پیار سے میرے پاس آتی ہے
جب پکڑتا ہوں بھاگ جاتی ہے

انھوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مستقل لکھتے رہے۔ بچوں کے لیے ان کی چند تخلیقات حسبِ ذیل ہیں:

ناول: چچا چونچ(مزاحیہ نیز یونائٹیڈ بینک انعام یافتہ)، شہر سے دور، گڑیوں کا شہر (مبہم جوئی)، جن شہزادی، گدھا کہانی

ڈرامے:پانچ ڈرامے (یونائٹیڈ بینک انعام یافتہ)، وہ ڈاکٹر نہیں تھا، اے وطن، میرے وطن، قوم کی بیٹی، تیس مار خاں (16ایڈیشن)، ڈالیاں، انسپکٹر صاحب آئے، سات کھیل، نانی اماں کی عینک (یونائٹیڈ بینک انعام یافتہ) ، بگی کی گڑیا، بچوں کے ڈرامے، ماں کا خواب (علامہ اقبال کی نظموں پر مبنی کھیل)

کہانیوں کے مجموعے:ایک آدمی، شیروں کا بادشاہ، باپ کی خدمت، چالاک ہرن

بچوں کے لیے لکھی گئی تخلیقات کے اجمالی جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ میرزا ادیب بچوں کے تئیں ادیب کی ذمے داری کو محسوس کرتے تھے۔ اور انھوں نے اس تعلق سے بھی بھر پور لکھا۔ ممکن ہے بچوں کے لیے لکھتے وقت اُن کے سامنے ماں کا وہ چھوٹا 'دلور' اور اس کے

Downloaded From Tajassus.com

احساسات عکس فگن ہوجاتے ہوں کیوں کہ ان کی بیشتر تخلیقات کو پڑھتے ہوئے ان کی خود نوشت سوانح 'مٹی کا دیا' ضرور یاد آتی ہے۔ یا پھر کہانی کے حوالے سے ان کا یہ تصور کہ: کہانی جس شے کا نام ہے، وہ سنانے کی شے ہوتی ہے۔ کہانی لکھی جاتی ہے مگر اس انداز سے جیسے سنائی جارہی ہے۔ کہانی کا یہ تصور میرے ذہن میں مستحکم ہے۔

ANS 04

میں ابن انشا ایک ایسے بنجارے کے روپ میں سامنے آتے ہیں جو گرد و پیش پر بیگانہ روی سے نظر ڈالتا ہے لیکن در حقیقت اس کی آنکھ اشیا کے باطن کو ٹٹولتی ہے اور ہمیں ان کے ماضی اور حال سے آشنا کرتی چلی جاتی ہے۔ ابن انشا کی شخصیت میں سر شار کے سیلانی اور میر امن کے درویش دونوں کی خصوصیات جمع ہو گئی تھیں۔ چنانچہ ان کے شوق کی کمی بھی نہیں تھی، اوروحشت کا توڑا بھی نہیں تھا۔ فقط سبب کی حاجت ہوتی تھی۔ اور یہ سبب کتابی دنیا کی کوئی غیر ملکی کانفرنس مدت مدید کا وقفہ ڈالے بغیر پیدا کر دیتی تھی۔ ابن انشا کے بیشتر اسفار سرکاری نوعیت کی کانفرنسوں کی بدولت ہی ظہور میں آئے اور سفروں کا حال اخباری ضرورتوں کے لیے لکھا گیا۔ چنانچہ اگر یہ کہا جائے کہ ابن انشا کے سفر نامے در حقیقت اخباری کالم ہیں جنے لئے مواد تجربات سفر سے حاصل کیا گیا ہے تو یہ درست ہو گا۔ صحافتی ضرورت نے بلا شبہ تاثر کو فوری طور پر ضبط تحریر میں لانے کی سبیل پیدا کی ہے لیکن فتح محمد ملک کا یہ خیال درست ہے کہ: "ابن انشا کے ہاں صحافتی انداز نظر کی بجاء فکری، تازگی اور ادبی رکھ رکھاؤ بدرجہ اتم موجود ہے۔ ابن انشا کا گہرے میٹھے طرز کا حامل شگفتہ و شاداب اندازبیان اور انسان دوستی کا رچا ہوا شعور اس پر مستزاد ہے۔"

ابن انشا کی منفرد خوبی ملکی اور غیر ملکی عادات کے درمیان موازانہ، رواں تبصرہ اور قول محال کی بوالعجبی ہے۔ ان کے اسی انداز نے سفر نامے کو پامال روایت سے الگ کر کے شگفتگی کی ڈگر پر ڈال دیا ہے۔ مثال کے طور پر چلتے ہو تو چین کو چلئے، سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے جو سبک طنز میں لپٹا ہوا ہے۔

پانی ابال کر پیتے ہیں، موبل ائل وہاں گاڑیوں میں ڈالا جاتا ہے۔ اصلی یاباناسپتی گھی کہہ کر" فروخت نہیں کیا جاتا۔ بھٹے کی اینٹیں بھی مکان بنانے کے کام آتی ہیں۔ ہلدی اور مرچ میں ملا کر ان سے تعمیر معدہ کا کام نہیں لیا جاتا۔ وہاں دودھ بھی گائیوں اور بھینسوں کا ہوتا ہے-- تالابوں یا کمیٹی کے نلکوں سے حاصل نہیں کیا جاتا-- ۔ وہاں آزادی کی سخت کمی ہے ہمارے ایک ساتھی جو اپنے ساتھ پاندان لے کر گئے تھے بار بار فرماتے تھے کہ یہ کیسا ملک ہے جہاں

Downloaded From Tajassus.com

سڑک پر بھی تھوک نہیں سکتے۔ ایک صاحب شاکی تھے کہ یہاں خریداری کا لطف نہیں، دکاندار بھاؤ تاؤ نہیں کرتے۔ ہوٹل کے بیروں کو بخششیں لینے اور مسافروں کو بخششیں دینے کی آزادی نہیں۔ بسوں اور کاروں کے اختیارات بھی محدود ہیں۔ آپ اپنی بس کو فٹ پاتھ پر نہیں چڑھا سکتے نہ کسی مسافر کے اوپر سے گزار سکتے ہیں۔ "

ابن انشا نے اپنے سفر ناموں میں عام قاری کی دلچسپی کے لئے معلوماتی مواد فراہم کرنے تاریخی واقعات بیان کرنے اور شخصیات کی سوانح نگاری کا فریضہ ادا کرنے کی کاوش بھی کی ہے۔ انہوں نے سفر نامے کو بیانیہ اسلوب میں بھی پیش کیا ہے کہیں قاری کو خطاب کرنے کی سعی بھی کی ہے اور کہیں درویش کا روپ دھار کر داستانی اسلوب اختیار کر لیا ہے یہ سب حربے در حقیقت تحیر ابھارنے اور قاری کی انگلی تھامے رکھنے کے حربے ہیں۔ دوسری طرف ابن انشا نے سفر نامے میں طنز لطیف اس طرح شامل کیا ہے کہ بات میں عمق اور اثر آفرینی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ہدف طنز چونکہ ان کا اپنا معاشرہ ہے اس لئے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ دل میں ایک سوئی بھی چبھ سی جاتی ہے۔ ابن انشا دوسرے ممالک کے معاشروں میں خیر اور نیکی کی قدروں کی جستجو زیادہ کرتے ہیں۔ اور فراز تہذیب کا موازنہ جب ابتذلی تمدن سے کرتے ہیں تو اس تضاد سے ایک بیساختہ مسکراہٹ کو جنم دے ڈالتے ہیں۔ ان کے ہاں لفظوں، محاوروں اور ضرب الامثال کی ہیئت تبدیل کرنے اور مزاجی کیفیت پیدا کرنے کا رجحان بھی نمایاں ہے اور اپنی اس صلاحیت سے انہوں نے سفر ناموں میں جابہ جافائدہ اٹھایا ہے۔ سفر نامے میں ابن انشا نے طنزومزاح کے جو حربے کامیابی سے استعمال کئے ہیں ان کی چند مثالیں حسب ذیل ہیں:

"ریل میں ہر نشست کے ساتھ چائے کے گلاس رکھنے کی جگہ ہے کام کرتے جائیے اور ایک ایک گھونٹ چسکتے رہئے۔ تھوڑی دیر میں کوئی آئے گا اور اس میں مزید گرم پانی ڈال جائے گا۔ معلوم ہوا کہ اس سے معدے کا نظام درست دیتا ہے۔ جراثیم کا دفعیہ ہو جاتا ہے۔ کم خرچ بلکہ بے خرچ بال نشین۔ ہم نے بھی کچھ دن پانی پیا پھر چھوڑ دیا۔ کس برتے پرتتا پانی۔ "

"میزبانوں نے اپنا تعارف کرایا۔ یہ رسمی کار روائی تھی۔ سنتے گئے اور ہوں ہاں کرتے گئے۔ اگلی صبح تک سب ایک دوسرے کے نام بھول چکے تھے۔ مہمانوں کا تعارف کرانا ہمارے ذمہ رہا۔ کیونکہ وفد کے لیڈر اراکین کے ناموں اور کاموں سے ابھی پوری طرح واقف نہیں تھے۔ ایک آدھ

Downloaded From Tajassus.com

جگہ البتہ شمع ان کے سامنے پہنچی تو انہوں نے ہمیں پاکستان کا ممتاز اور مشہور ناول نویس قرار دیا اور چونکہ تردید کرنا خلاف ادب تھا۔ لہٰذا ایک مہمان کے اشتیاق آمیز استفسار کے جواب میں ہمیں اپنے ناولوں آگ کا دریا، خدا کی بستی، آنگن وغیرہ کی تعداد بتانی پڑی۔ وہ ان تصانیف کے نام بھی نوٹ کرنا چاہتے تھے لیکن ہم نے از راہ انکسار کہا کہ اس کی ضرورت نہیں۔"

"ہم جو چین گئے تو سب سے پہلے یہی مسئلہ پیدا ہوا۔ چین میں اخبار ہوتے ہیں لیکن چینی زبان میں اور وہ بھی شام کو نکلتے ہیں۔ صبح نکلتے تو کم از کم ان کی تصویریں دیکھنے کے لئے باتھ روم جایاجا سکتا تھا۔ نتیجہ اخبار نہ دیکھنے کا یہ ہوا کہ ہمارے ادیبوں کے وفد کے اکثر رکن قبض کا شکار ہو گئے۔ ڈاکٹروں نے بہت دوائیں کیں لیکن بے فائدہ۔ آخر ہم نے کہا۔ ان کے لئے اخبار منگوانا شروع کیجئے۔ یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے۔ چینی نیوز ایجنسی کا بلٹن انہوں نے بھیجنا شروع کر دیا۔ اس صورت حال کی پوری طرح اصلاح تو نہ ہوئی لیکن بعضوں کا ہاضمہ پہلے سے بہتر ہو گیا۔"

ابن انشا کے طنز میں فطری نفاست ہے اور اس کا مزاج غیر جذباتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے جملوں کے بین السطور معانی زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ اس بالواسطہ انداز نے ان کے سفر ناموں کو تابانی اور مسکراہٹ عطا کی ہے اور انہوں نے معاشرتی ناہمواریوں کو طشت از بام کرنے کے لے سفر نامے سے قابل قدر کام لیا ہے۔ ان کے عملی مزاح کی صورت یہ ہے کہ انہوں نے سفر نامے کو کالم میں شامل کر کے صحافت کی ضرورت بنا دیا۔ ان اوصاف کی بنا پر ابن انشا کو پڑھنے والوں کا وسیع حلقہ نصیب ہو اور یہ ان کی وفات کے بعد مزید بڑھتا چلاجا رہا ہے۔

ANS 05

ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ اسے ہنسنا اور ہنسانا آتا ہے، درست ہے کہ "ہنسنا" خوشی کے احساس کا نام ہے، لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا ہر ہنسی خوشی کا اظہار ہوا کرتی ہے، کیونکہ جو لوگ اپنے دکھ درد اپنے دل میں چھپا کر ہنس رہے ہیں ان کی ہنسی، دل لگی اور مذاق کو کیا نام دینا چاہیے۔ صرف ہنسنے اور ہنسانے کا عمل مزاح نہیں، مزاح نہ لطیفہ گوئی ہے ، نہ تضحیک نہ طنز۔ اس کے لیے لہجے کی ظرافت، عظمت خیال اور کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ مہذب جملوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مزاح وہی ہے جو بظاہر تو ہلکی پھلکی لطافت اور ظرافت میں ڈوبی تحریر لگے لیکن قاری کو لطیفے پر قہقہہ لگا کر بھول جانے کے بجائے

Downloaded From Tajassus.com

یکلخت اس تحریر کی گہرائی میں جا کر سنجیدگی سے اپنے آپ کا جائزہ لینے پر مجبور کر دے۔ رد عمل بجلی کی چمک کی طرح ذہن میں اس طرح کوندے کہ اسے لگے کہ کسی نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔اور ایک ایسا مزاح جو جذبات کو مجروح کیے بغیر، اور کسی کی دل آزاری سے عاری ہو وہ صرف مطالعے ہی سے وجود میں آتا ہے۔مشتاق احمد یوسفی کو نفسیات انسانی اور جذبات انسانی کا مکمل شعور تھا، ان کی تحریروں میں طنز اور مزاح اصلاح معاشرہ کے معنوں میں استعمال ہوتا نظر آتا ہے۔ وہ پچھلے کئی برسوں سے اس عرق ریزی کے ذریعے اپنے قارئین و سامعین کو زمانے کی تلخیوں سے روشناس کرواتے رہے ہیں، اور اپنی زندہ جاوید ہستی سے اچھا اور مثبت مزاح تخلیق کرتے رہے ہیں۔ ان کا ہر مضمون ہم جیسے ایک عام آدمی کا ایسا خاکہ ہے جس میں کروڑوں انسانوں ہی کی نہیں بلکہ پوری تہذیب اور ثقافت کی تصویر ملتی ہے۔ مشتاق احمد یوسفی ایک رجحان ساز اور صاحب اسلوب مزاح نگار تھے ، انہوں نے نہ صرف اردو ادب کو مزاح کے میدان میں بے پایاں عزت دی بلکہ جدید اسلوب سے اس کی خوبصورت تشکیل بھی کی ۔

مشتاق احمد یوسفی 4 اگست1921ءمیں ہندوستان کی ریاست ٹونک(راجھستان) میں پیدا ہوئے،ان کا آبائی وطن جے پور جسے ”پنک سٹی“ بھی کہا جاتا ہے تھا جہاں انہوں نے گریجوایشن تک کی تعلیم حاصل کی۔ پھر علی گڑھ یونیورسٹی سے فلسفے میں ایم اے اور ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی، تعلیم سے فراغت کے بعد آئی سی ایس کا امتحان پاس کیا اور 1950ءتک بھارت میں ڈپٹی کمشنرکے عہدے پر فائز رہے۔ تقسیم ہند کے بعد جب ان کے والدین نے پاکستان ہجرت کی تو وہ بھی 1956ءمیں کراچی منتقل ہوگئے ۔ یہاں انہوں نے بنکاری کے پیشے کا انتخاب کرتے ہوئے مسلم کمرشل بنک سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا، جہاں وہ بڑے عہدوں پر فائز رہے اور ترقی کرتے کرتے بینک کے صدر بنے، اور پھر یونائیٹڈ بنک کے بھی صدر رہے، لیکن اعلیٰ عہدوں پر خدمات کے باوجود ان کی اصل پہچان اردو کی مایہ ناز مزاح نگاری بنی۔ مشتاق احمد یوسفی صاحب نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز”مشتاق احمد“ کے قلمی نام سے کیا، 1955ءمیں ان کا پہلا باقاعدہ مطبوعہ مضمون ”صنف لاغر“ معروف ادبی جریدے ماہنامہ ”ادب لطیف“ کے مدیر میرزا ادیب نے شائع کیا۔ اردو زبان وادب کے صف اول کے ادیبوں میں شمار کیے جانے والے مشتاق احمد یوسفی کے مزاح کی خصوصیت ان کا منفرد انداز ہے۔ آپ لفظوں سے کھیلتے اور موقع ومحل کی مناسبت سے ان کے خوب صورت بر جستہ استعمال سے ایک نئے معانی عطا کردیتے تھے۔ اور ایک تخلیق کار کی اس سے بڑھ کر کامیابی کیا ہو سکتی ہے کہ وہ جھنجلاہٹ میں مبتلا نہیں ہوتا، بلکہ ہنس ہنس کر اور ہنسا کر زندگی کو گلے لگاتا ہے۔ یوسفی صاحب طنز و مزاح نگاری کے لیے مضمون، آپ بیتی، خاکہ،

Downloaded From Tajassus.com

تاریخ، مرقع، افسانہ، ناولٹ، ناول جیسی اصناف کو استعمال میں لائے اور انہوں نے مزاحیہ نثر میں بدنظمی کا شائبہ تک پیدا نہیں ہونے دیا۔ مزاح کے اس معیار پر جب ہم مشتاق احمد یوسفی کی تحریروں کا جائزہ لیتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ مشتاق احمد یوسفی مزاح کی معراج پرتھے۔ یوسفی صاحب نے پانچ مقبول عام کتابوں ، چراغ تلے 1961، خاکم بدہن 1969، زرگزشت 1976ء، آب گم 1990، شامِ شعر یاراں2014، کی صورت میں اردو ادب کو مزاح کے بہترین نمونوں سے نوازا۔ حکومت پاکستان کی جانب سے اردو مزاح میں شاندار خدمات کے اعتراف میںمشتاق احمد یوسفی کو 1999ءمیں ستارہ امتیاز اور 2002ءمیں ہلال امتیاز سے نواز ا گیا۔ ان کی پر لطف کتابوں کے بارے میں ابن انشا نے لکھا تھا کہ ”یوسفی صاحب کی کتاب منگوائی ہے اور ابھی تک پڑھی نہیں کیونکہ اگر پڑھ لیا تو ختم ہوجائے گی اور اگلے دس سال تک یہ کوئی کتاب نہیں لکھیں گے“۔ اپنی تحریروں میںمعاشرتی پہلوؤں کا بغورمشاہدہ اور ان پر بطریق احسن طنز کی طبع آزمائی بھی یوسفی کا کمال خاصہ تھا۔ جب معاشرتی برائیوں کو طنز کی زدمیں لاتے تودلچسپ پہلوؤں پر گدگداتے فقرے جست کرکے حیرت میں ڈال دیتے ، بدلتے انسانی رویوں کونشتر مزاح پر اس شائستگی سے رکھتے کہ قاری انکی بات پر مسکرائے اور اثبات میں سر ہلائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ گزشتہ دنوں ان کی دوسری برسی پر یہ یقین ہی نہیں ہوپارہا تھا کہ مزاح کا عہد یوسفی اپنے اختتام کو پہنچ گیا ہے، ان کی وفات سے اردو ادب میں معیاری مزاح نگاری کا خلاءشاید کبھی پر نہ ہوسکے۔

شتاق احمد یوسفی کی چند خوبصورت تحریریں ملاحظہ کریں۔

(1)۔ میرا خیال ہے کہ حالات حاضرہ پر تبصرہ کرتے وقت جو شخص اپنے بلڈ پریشر اور گالی پر قابو رکھ سکے وہ یا تو ولی اللہ ہے یا پھر وہ خود ہی حالات حاضرہ کا ذمہ دار ہے۔

(2)۔ اندرون لاہور کی چند گلیاں اتنی تنگ ہیں کہ اگر ایک طرف سے مرد اور دوسری طرف سے عورت گزر رہی ہو تو درمیان میں صرف نکاح کی گنجائش رہ جاتی ہے۔

(3)۔ جو اپنے ماضی کو یاد نہیں رکھنا چاہتا وہ یقیناً لوفر رہا ہوگا۔

(4)۔ سمجھدار آدمی نظر ہمیشہ نیچی اور نیت خراب رکھتا ہے۔

(5)۔ مجھے اس پر قطعی تعجب نہیں ہوتا کہ ہمارے ملک میں پڑھے لکھے لوگ خونی پیچش کا علاج تعویز، گنڈوں سے کرتے ہیں۔ غصہ اس بات پر آتا ہے کہ وہ واقعی اچھے ہوجاتے ہیں۔

(6)۔ بناؤ سنگھار ہر عورت کا حق ہے، بشرطیکہ وہ اسے فرض نہ سمجھ لے۔

(7)۔ بڑھیا سگریٹ پیتے ہی ہر شخص کو معاف کر دینے کا جی چاہتا ہے، خواہ وہ رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔

Downloaded From Tajassus.com

-(8) ایک فرنچ ادیبہ کیا خوب کہہ گئی ہیں کہ میں آدمیوں کو جتنے قریب سے دیکھتی ہوں اتنے ہی کتے اچھے لگتے ہیں-

-(9) موسم، معشوق اور حکومت کا گلہ ہمیشہ سے ہمارا قومی، تفریحی مشغلہ رہا ہے-

-(10) مرد پہلے بحث کرتے ہیں، پھر لڑتے ہیں، عورتیں پہلے لڑتی ہیں، پھر بحث کرتی ہیں مجھے ثانی الذکر طریقہ زیادہ مقبول نظر آتا ہے، اس لئے کہ اس میں آئندہ سمجھوتے اور میل ملاپ کی گنجائش باقی رہتی ہے

Downloaded From Tajassus.com